شیخ محمد ابراہیم ذوق

اردو قصیدہ نگاری میں سودا کے بعد دوسرا درجہ ذوق کا ہے۔ گویا وہ اردو کے دو بڑے قصیدہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ غزل کے بعد جس صنفِ سخن پر ان کی توجہ مرکوز رہی وہ قصیدہ ہی ہے۔ دہلی کے دربارِ شاہی سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ وہ ولی عہد سلطنت کے استاد تھے جو آگے چل کر تخت نشین ہوئے۔ قلعے کی مختلف تقریبات کے موقعے پر ذوق مبارکباد کے قصیدے کہہ کر دربار میں پڑھا کرتے تھے اور انعام واکرام سے نوازے جاتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں ــــ

"جب تک اکبر شاہ زندہ تھے تب تک ان کا (استاد ذوق کا) یہ دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا ولی عہد بہادر (یعنی بہادر شاہ ظفر) کو سناتے دوسرے دن ولی عہد ممدوح اس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈال کر لے جاتے اور دربارِ شاہی میں سنواتے۔"

مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ استاد ہر جشن کے موقعے پر ایک قصیدہ کہتے تھے اور خاص خاص تقریبات کے لیے الگ سے قصیدے کہہ کر پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے قصائد کی تعداد بہت تھی مگر ان میں سے بیشتر ضائع ہو گئے۔ بقولِ آزاد "عالمِ جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ رہا ہے وہ چند قصیدے ہیں کہ بڑھاپے کی ہمت کی برکت ہے" مگر تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ ذوق کے جو قصائد دستیاب ہیں ان میں جوانی کے قصیدے بھی شامل ہیں۔ بہرحال اتنا ثابت ہے کہ ذوق نے بہت سے قصیدے کہے جن میں سے آدھے کے قریب ۱۸۵۷ کی بغاوت کے دوران ضائع ہو گئے۔ ظاہر ہے اتنے قصیدے کہنے سے مشق کا اچھا موقع فراہم ہوا اور ذوق کو اس فن میں مہارت حاصل ہو گئی اور ان کے قلم سے ایسے قصیدے وجود میں آئے جن کی بدولت اردو قصیدے کی تاریخ میں سودا کے بعد

Scanned by TapScanner

وہ دوسرے مقام کے حقدار ٹھہرے۔ ان کی قصیدہ نگاری کے بارے میں محمد حسین آزاد کی رائے ہے :۔

"نظم اردو کی نقاشی میں مرزا موصوف (یعنی سودا) نے قصیدے پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد یہ موصوف کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا اور انھوں نے مرقعے کو ایسی اونچی محراب پر بجایا کہ جہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ انوری ظہوری عرفی فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان پر کر دکھایا۔"

اپنے استاد کے بارے میں شاگرد کا یہ بیان یقیناً مبالغہ آمیز ہے۔ اردو قصیدے کے فروغ میں ذوق نے خواہ کتنا ہی اہم کردار ادا کیا ہو لیکن یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی سرزمین کو آسمان پر کر دکھایا۔ کلیم الدین احمد کی رائے میں البتہ توازن نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"ذوق نے بھی قصائد نہایت اہتمام و کاوش سے لکھے۔ ہر قصیدے کا رنگ جدا ہے۔ ہر قصیدے میں ایک نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تنوع میں بھی سودا کی پیروی کرتے ہیں لیکن وہ جوش اور گرمی، وہ اصلیت میسر نہیں۔"

ذوق کے جو قصیدے دستیاب ہیں ان کی تعداد پچیس کے قریب ہے۔ ممدوحین کا دائرہ بھی محدود ہے۔ ایک قصیدہ مرزا مغل کی مدح میں ہے۔ باقی سب کے سب اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ حیرت ہے کہ مذہب سے گہرا شغف ہونے کے باوجود انھوں نے بزرگان دین کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔

ان کے قصیدوں کو سودا کے قصیدوں کے سامنے رکھ کر دیکھیے تو احساس ہوتا ہے کہ مضامین و موضوعات کے اعتبار سے بھی ان کا دائرہ محدود ہے۔ سودا کے برعکس انھوں نے جتنے قصیدے لکھے وہ طبیعت کی اپج سے نہیں صرف فرض ادا کرنے کے لیے طبیعت پر جبر کر کے لکھے اس لیے وہ جوش و خروش اور احترام کے فطری اظہار سے خالی ہیں۔ بے شک ان قصیدوں سے شاعر کی فن کارانہ صلاحیت اور علمی لیاقت کا پتہ چلتا ہے، مطالعے کی وسعت اور تخیل کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، بیان پر قدرت اور زبان کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے لفظوں میں شاعر کی

"جدت طرازی، اختراع پسندی اور ندرت کاری" کا قائل ہونا پڑتا ہے لیکن قصیدہ نگاری کے لیے جس خلاقانہ صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان کے یہاں ناپید ہے۔

علوی صاحب کا یہ ارشاد بھی بجا ہے کہ ذوق کے ابتدائی زمانے کے قصیدوں میں تکلف، مبالغہ اور آورد نسبتاً کم ہے بلکہ اس کی جگہ ایک فطری اپج، جوش اور روانی ملتی ہے۔ آگے چل کر کچھ تو شاہ نصیر سے معرکہ آرائی کے سبب اور کچھ ملکہ سخن کی دھاک جمانے کے خیال سے ان کی توجہ مشکل گوئی اور صناعی کی طرف زیادہ مبذول رہی۔ تشبیب میں علمی اصطلاحات، تلمیحات اور حکیمانہ خیالات کا اضافہ ہو گیا۔ مبالغہ اور معنی آفرینی پر زیادہ توجہ ہو گئی۔ اسی زمانے میں ایک ایسا قصیدہ کہا تھا جس کے اٹھارہ شعر اٹھارہ مختلف زبانوں میں تھے۔ اسی پر انھیں خاقانیِ ہند کا خطاب عطا ہوا تھا۔ آخری زمانے میں تصنع کم ہو گیا تھا اور پختگی و متانت نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں انھوں نے اپنا مشہور قصیدہ "شب کو میں اپنے سر بسترِ خوابِ راحت" لکھا جو مختلف مصطلحات کے استعمال اور علمی مسائل کے اظہار میں اپنی نظیر آپ ہے۔

آیئے اب قصائدِ ذوق کے مختلف اجزا کا تنقیدی جائزہ لیں۔

مطلع : قصیدے کا مطلع اس لحاظ سے نہایت اہم ہوتا ہے کہ اسی کی کامیابی پر قصیدے کی پذیرائی کا دارومدار ہے۔ مطلع ممدوح اور سامعین کو اپنی گرفت میں لے لینے کی صلاحیت رکھتا ہو تو یہ قصیدے کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ذوق نے بعض مطلعے بہت خوب کہے ہیں۔ ان میں ندرت بھی ہے اور دلکشی بھی۔ دیکھیے دو مثالیں۔

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی　　برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی

*

ہیں مری آنکھوں میں اشکوں کے تماشا گوہر　　اک گہر ٹوٹے تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

تشبیب : ذوق علمی اصطلاحوں کے بادشاہ ہیں۔ تشبیب میں وہ عام طور پر فلسفہ، منطق، نجوم، طب، تصوف اور موسیقی وغیرہ سے متعلق اصطلاحوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں، صنعتوں سے بہت کام لیتے ہیں۔ لیکن ذوق کی تشبیب سے بالعموم ایک فرضی تصویر ابھرتی ہے۔ لفظوں کا زیر و بم اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، فن کارانہ صورت گری کی داد دینی پڑتی ہے۔ دقت پسندی اور نزاکت آفرینی کا قائل

Scanned by TapScanner

[illegible] ایک مثال پیش خدمت ہے ـــ

سحر جو گھر میں یہ شکل آئینہ تھا میں بیٹھا نظارہ حیراں

تو اک پری چہرہ حور طلعت پہ شکل بلقیس و ماہ کنعاں

پری کی صورت، چمن کی رنگت، گر اس کا شیوہ تو اس کا جلوہ

زبانِ شیریں، بیانِ رنگیں، کلامِ رنداں، خرامِ مستاں

انیسِ خلوت، جلیسِ جلوت، حریفِ حکمت، ظریفِ صحبت

بہ بزمِ یاراں، بہ دل بہاراں، بہ اہلِ عزلت گلے بداماں

نگاہ ساغر کشِ تماشا، بیاضِ گردن صراحی آسا

وہ گول بازو، وہ گوری ساعد، وہ پنجہ رنگیں بخونِ مرجاں

وہ رانِ روشن، وہ ساقِ سیمیں، وہ پائے نازک، حنائیں رنگیں

وہ قدِ قیامت، وہ فتنہ قامت، دلوں پہ شامت جو ہو خراماں

گریز: قصیدے میں گریز کی بہت اہمیت ہے۔ اس کا کام تشبیب اور مدح میں ایسی گرہ لگانا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں۔ بے شک گریز کے معاملے میں ذوق بعض جگہ مہارت کا ثبوت دیتے ہیں لیکن قصیدے کا یہ مقام جس خونِ جگر اور جس خلاقانہ صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے وہ ذوق کی شاعری میں ناپید ہے۔ پھر بھی بعض قصیدوں میں وہ ایسی گریز لکھتے ہیں کہ حق ادا ہو جاتا ہے۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں اپنی صلاحیت اور فکرِ رسا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھیں زمانے کی نامہربانی یاد آجاتی ہے تو گریز کے لیے ایک نادر انداز فراہم ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

نہیں رہا تری گردش سے کچھ مجھے سروکار	گر ترقیِ ایام کیوں کروں اے چرخ
کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جس پہ لیل و نہار	ہے کیا اتنا مقدر اس آستاں پہ مجھے

مدح: مدح قصیدے کا بنیادی جز ہے کیونکہ قصیدہ لکھنے کا مقصد یہی ہے کہ کسی کی مدح کی جائے اس لیے شاعر اس حصے پر بہت توجہ صرف کرتا ہے اور مدح کو زیادہ سے زیادہ پُرزور بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ممدوح خوش ہو جائے۔ مدح کے معاملے میں مبالغے سے کام لیا جانا ناگزیر ہے۔ مولانا حالی نے قصیدہ نگاروں کی مبالغہ آرائی کو بے حد ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے لیکن

مبالغے کے بغیر مدح کا حق ادا کرنا ممکن ہی نہیں۔

مرزا مغل کی مدح میں ذوق کا صرف ایک قصیدہ ہے۔ باقی قصیدے یا تو اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہیں یا بہادر شاہ ظفر کی مدح میں۔ ان دونوں بادشاہوں سے بہت پہلے مغل سلطنت اپنا وقار کھو بیٹھی تھی۔ یہ مغل بادشاہ کتنے ہی مجبور و لاچار سہی، کتنے ہی کمزور اور بے اثر سہی لیکن رعایا کے دلوں میں ان کا احترام باقی تھا کیونکہ تھے تو یہ بابر، اکبر اور شاہجہاں کے وارث و جانشین۔ ذوق نے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی جو مدح کی ہے وہ کتنی ہی بے بنیاد سہی لیکن شاعری کے نقطۂ نظر سے بالکل درست ہے۔ قدیم علمائے ادب نے بہ اتفاقِ رائے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قصیدہ نگار کسی ممدوح کے ذاتی اوصاف بیان نہیں کرتا بلکہ ممدوح میں وہ خوبیاں دکھاتا ہے جو اس طبقے سے متعلق ہیں مثلاً کسی بادشاہ کا ذکر ہو تو اس میں وہ اوصاف دکھائے جائیں گے جو بادشاہوں میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ اعتراض غلط ہوگا کہ ذوق نے اپنے ممدوحین کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان کے وہ مستحق نہیں تھے۔ اور اب ملاحظہ ہو مدح کا ایک نمونہ ــــ

آگے رتبے کے ترے خاک ہے جرمِ کیواں	آگے جلوے کے ترے پرتوِ خورشید ہے گرد
موکشاں لاتی ہے در پہ ترے یوں سرگرداں	ہوسِ ناصیہ سائی تری خورشید کو روز
ہر شکن سے ہو عیاں لجۂ بحرِ عمّاں	آستیں اپنی ہلا دے جو ترا دستِ کرم

حسنِ طلب اور دعا: قصیدے کا آخری حصہ دعا ہے اور دعا سے پہلے قصیدہ گو اپنے ممدوح کے سامنے اپنی غرض بھی رکھتا ہے اور کبھی واضح لفظوں میں تو کبھی اشارے کنایے میں ممدوح سے کچھ طلب کرتا ہے۔ ذوق نہایت قناعت پسند تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی قناعت کی تعلیم دیتے تھے۔ انھوں نے کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ وہ اپنے زمانے کے نامور قصیدہ نگار تھے۔ اگر چاہتے تو دوسرے درباروں میں قصیدے پیش کر کے رسائی حاصل کرتے یا کم سے کم انگریز ریذیڈنٹ کی خوشامد کرتے نظر آتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے ممدوحین کی تعداد حد سے زیادہ مختصر ہے۔ اس سے بھی ان کی قناعت کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ عام طور پر انھوں نے اپنے قصیدوں میں اپنا مدعا بیان نہیں کیا صرف دعا سے سروکار رکھا۔ دعا کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ختم کرتا ہے سخن ذوق دعا پر اس طرح
تا ہو دریا میں گہر، کان میں پیدا الماس
توشۂ بحر و بر اے شاہِ سمندر فر ہو
دے خدا عمرِ خضر تجھ کو، حیاتِ الیاس

ذوق قصیدہ نگاری میں سودا کے مدمقابل نہ سہی لیکن سودا کے بعد اردو قصیدے میں اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ ذوق ہی ہیں۔ بقولِ فراق "سودا اگر آسمانِ قصیدہ کے نصف النہار ہیں تو ذوق اسی آسمان کے ماہِ کامل ہیں"۔ اس مختصر مضمون کے آخر میں ہم فراق کی ہی ایک اور عبارت پیش کرنا چاہیں گے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں ذوق کا اصل مقام کیا ہے:۔

"ذوق کی شاعری جزویست از پیغمبری نہ سہی، ساحری نہ سہی، اس میں نشتریت نہ سہی، نمک نہ سہی لیکن ذوق کی زبان میں جو شیرینی ہے اس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ ذوق کے کلام میں اردو نے اپنے آپ کو پایا۔ روایتی باتوں کو اتنی سنوری ہوئی اور مکمل شکل میں پیش کر دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ شہرتِ دوام کے دربار میں غالب و مومن کی صف میں ان کے برابر بلکہ مومن سے کچھ آگے زبان کی شاعری کے پختہ نمائندے کی حیثیت سے بیٹھے اور دستارِ فضیلت زیبِ سر کیے ہوئے استاد ذوق وہ نظر آ رہے ہیں!" ✻ ✻

Scanned by TapScanner